OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

قرۃ العین حیدر کے ناول "آخر شب کے ہم سفر" میں اماکن کا تذکرہ

Enumeration of places in Quratulain Haider's Novel "Akhir Shab kay Humsafar"

Dr. Elizabeth Shad
Assistant Professor, Kinnaird College for Women University, Lahore
Taiba Sohail
Ph.D. Urdu (Scholar), G.C University, Lahore
Dr. Muhammad Amjad Abid
Associate Professor, Department of Urdu, University of Education, Lahore

Abstract

Quratulain Haider is one of the most celebrated authors of urdu literature. Though her magnum opus "Aag ka darya" is the most renowned novel of urdu language but her other writings are no less. "Akhhir shab kay hamsafar" is also an excellent depiction of exceptional piece of literature by this literary Giant. This novel was not only contemporary at the time of writing but also represents the authentic eye witnessed accounts of the partition of Bengal in 1971. Scores of places and institutions stated in this novel make this account more authentic and closer to reality. In this article all these places and institutions and their political and geographical importance is been discussed and hereby thus this article proves the importance of places and buildings in a piece of literature moreover

CC BY

this article also provides proofs of historical accuracies in Haiders novels.

Keywords: Quratulain Haider, Bengal, Novel, Akhir-shab kay Humsafar, Historical, Partition Literature, Geographical literature, Buildings, Rabindranath Tagore

تمہید

قرۃ العین حیدر کے ناول "آخر شب کے ہمسفر" کے ذہنی، روحانی اور جذباتی رویے تاریخی اور سماجی مرقعوں سے قطع نظر سیاسی بصیرت کا ثبوت ہیں۔ انھوں نے جو رویے اور ان کا وقتی جوش 1979 میں دکھایا آج وہ کسی پیش گوئی کی طرح بعین پورا ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ افراد سانحوں کو بھول کے نئی ڈگر پر گامزن ہیں بلکہ نئے سانحے تخلیق کر رہے ہیں۔ "آخر شب کے ہمسفر" قرۃ العین حیدر کے کامیاب ترین ناولوں میں سے ایک ہے بلکہ بسا اوقات ناقدین اسے "آگ کا دریا" سے بھی بڑا ناول قرار دیتے ہیں۔ مذکورہ ناول میں بنگال کی جادوئی سرزمین کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ اس ناول میں سقوطِ بنگال کے داخلی خلفشار اور باطنی خونریزی کو دیپالی سرکار اور ریحان الدین کی کہانی میں ڈھالا گیا ہے۔ مشرقی پاکستان کا علیحدہ ہونا ایک اہم تاریخی واقعہ تھا جسے قرۃ العین حیدر نے اپنے تخلیقی جوہر سے کہانی میں پیش کیا ہے۔

قرۃ العین حیدر اردو کے ان چند گنے چنے ادیبوں میں شامل ہیں جن کے ہاں تاریخ کے بدلتے منظر نامے کی گونج درون و بین السطور سنی جا سکتی ہے۔ اگرچہ ان کے ناولوں کو تاریخی ناولوں کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا مگر بلاشبہ ان کی کہانیوں میں تاریخ کے تانے بانے کی بنائی ضرور دیکھی جا سکتی ہے۔ قرۃ العین حیدر کے تصورِ مکاں کا مطالعہ ان کے تصورِ تاریخ و تہذیب کو سمجھنے کے لئے جمشید کے جامِ جہاں نما سے کم ہرگز نہیں ہے۔ ان کے تصورِ مکاں کو سمجھ کر نہ صرف ان کے کلام کا فکری بلکہ فنی مطالعہ بھی آسانی سے کیا جا سکتا ہے بالخصوص ان کے ناول "آخر شب کے ہمسفر" میں درج مختلف علاقے، جگہیں، عمارات بذاتِ خود تاریخ کے وہ اوراق ہیں جن سے نبرد آزما ہو کر پاکستان تخلیق ہوا اور پھر مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کے نام سے موسوم ہو کر دنیا کے نقشے پر ابھرا۔

> "آخر شب کے ہمسفر" کا مرکزی تصور ایک تکلیف دہ تاریخی عمل کے گرد گھومتا ہے؛ جس کے تسلسل اور تضاد کی بدولت یہ کردار دائمی اذیت میں مبتلا رہتے ہیں۔ برعظیم کی ابھرتی ہوئی قومی تحریکوں کو کچلنے والے انگریز حکمران بھی اس تاریخی پھیلاؤ میں شامل تھے۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ تھے؛ ان کے بغیر اس عہد کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ دیپالی، روزی، اوما اور ریحان تاریخی عمل کو تیز کرنے کی سعی میں پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتے۔ وہ ہر حوالے سے حالات کو

تبدیل کرنے کے متمنی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مزاج کی اضطراری کیفیت انہیں سکون نہیں لینے دیتی۔ شروع میں وہ محبت اور رومان کے زیر سایہ دنیا کے تفرقوں اور ناانصافیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں لیکن یہ سارے انقلاب کی بات کرنے والے زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے دکھائی دیتے ہیں بل کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ یہ اپنے روپ اس طرح بھر لیتے ہیں کہ ان کی شکلیں بھی پہچانی نہیں جاتیں۔ کبھی کچھ کبھی کچھ مگر آخر کار وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آتے ہیں"[1]

ناول کا آغاز

ناول کا آغاز قیام پاکستان سے قبل ہوتا ہے جب موجودہ بنگلہ دیش متحدہ ہندوستان کا حصہ تھا اور انگریز کی عمل داری تھی۔ قرۃ العین حیدر نے اس ناول میں قیام پاکستان سے قبل عصری شعور اور سیاسی فہم وبصیرت رکھنے والے افراد کا مرقعہ پیش کیا ہے جو یہ جانتے تھے کہ انگریز کے جانے کے بعد دونوں اکثریتی عوام آپس میں باہم دست و گریبان ہو جائیں گے۔ یہ ناول قریب چالیس سال کی بنگلہ تاریخ کا احاطہ کرتا ہے قیام پاکستان اور پھر قیام بنگلہ دیش کے مفصل تاریخی مرقعے اس ناول میں پیش کیے گئے ہیں۔ قراۃ العین حیدر نے اپنے روایتی انداز کے مطابق اس ناول میں بھی کشت وخون اور وحشت ناک مناظر دکھانے سے احتراز برتا ہے البتہ ہلکورے لیتی تاریخ کے جھولنے میں قیام بنگلہ دیش کے وقت ہونے والی خونریزی کے اشارے ضرور دیئے ہیں۔ قیام بنگلہ دیش کے پس منظر اور مابعد نتائج کے حوالے سے قراۃ العین حیدر کی یہ تصنیف ایک ناول ہی نہیں بلکہ مکمل عصری و معاشرتی تاریخی دستاویز قرار دی جاسکتی ہے۔ یہ ناول بنگال کی بنتی بگڑتی تقدیر، انحطاط پذیر قوموں کے رویوں، عزت اور وقار کے جھوٹے دکھاوں، جن کا مقصد دوسروں سے زیادہ خود فریبی ہوتا ہے، قیام پاکستان، پوسٹ اور پری پارٹیشن کا بنگال اور ان کے گرد و پیش کے گنجلک انسانی رویوں سے گوندھا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے اطراف سے کردار اکٹھے کئے اور انہیں کہانی کا حصہ بنا دیا۔ ریحان الدین احمد کا کردار مولانا بھاشانی سے متاثر شدہ لگتا ہے تو یاسمین کا کردار قرۃ العین کی اپنی چچازاد بہنوں عذرا اور زہرا کا من و عن پر تو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ کردار جو حقیقی زندگی میں نہیں کر سکے وہ قرۃ العین کی کہانیوں میں بس کے کر سکتے ہیں کرداروں پر ہی کیا موقوف قرۃ العین حیدر نے جو مقامات استعمال کئے ہیں وہ سب بھی بیشتر حقیقی ہیں۔ کرداروں کے چناؤ میں اگر کوئی احتیاط در پیش تھی تو مقامات کے لیے ایسی کوئی شرط روا نہیں اس لیے انہوں نے سینکڑوں حقیقی مقامات کو پس منظر بنا کر یہ کہانی تخلیق کی۔ ان مقامات کا استناد شخصیات سے کہیں معتبر ہے۔ شخصیات کے ضمن میں روا رکھی گئیں تمام تر احتیاطی تدابیر کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے اس ناول میں مقامات کا ایک لامتناہی انبوہ پیش کر دیا ہے۔ یہ تذکرہ کہیں بھی طویل نہیں لہذا یہ مقامات بڑی شان سے انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑ کر کہانی کی جان بن جاتے ہیں۔ اس مقالے میں ان ہی مقامات کا جائزہ لیتے ہوئے اس ناول کے تصور مکاں کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مذکورہ ناول میں قرۃ العین حیدر نے کم و بیش 120 شہروں اور مقامات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض بڑے شہر اور بعض چھوٹے چھوٹے گاؤں ہیں۔ اسی طرح عمارات کا ذکر بھی جابجا کثرت سے ملتا ہے۔ جو زیادہ تر حقیقت میں موجود ہیں۔ یہ ذکر خارج از دلچسپی نہیں ہے کہ 1979 میں زیور طباعت سے آراستہ ہونے والے اس ناول میں مذکور بیشتر عمارات آج بھی پوری شان و شوکت سے استادہ ہیں۔ ذیل میں ان عمارات و مقامات کا جائزہ لیا جائے گا جنہیں قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول کے پس منظر کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرۃ العین حیدر نے ان سیاسی ابواب کو ورطہ تحریر میں لانے سے قبل نقشے پر مقامات نشان زد کر رکھے ہیں۔ درج ذیل پیراگراف میں اگرچہ بظاہر ان کا مقصد سیاسی منظر نامے کی اشاعت ہے مگر سرسری جائزہ لینے پر ہی ایسا معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے علاقوں کو مد نظر رکھ کر ہی یہ سطور ترتیب دی ہیں۔

"عدم تعاون اور خلافت کی تحریک کی ناکامی کے بعد 1924 میں تشدد پسند تحریک دوبارہ شروع ہوئی اور پھانسی کی کوٹھریاں آباد ہوئیں۔ یو-پی میں انقلابیوں نے کاکوری میں سرکاری خزانہ لوٹا اور اشفاق اللہ اور اس کے ساتھی پھانسی پر چڑھے۔ آندھرا میں الوری سیتارام راجو کے گوریلا دستے حکومت سے لڑتے پھرتے اور مارے گئے۔ سردار بھگت سنگھ نے مرکزی اسمبلی میں بم پھینکا اور کہا کہ ان کا مقصد ملک میں اشتراکی حکومت قائم کرنا ہے اور پھانسی پر چڑھے۔ ہندوستانی سوشلسٹ ری پبلکن آرمی کے کمانڈر الہ آباد میں پولیس سے لڑے اور مارے گئے۔ چاٹگام میں 22 اپریل 1930 کو آئرلینڈ کے ایسٹر سنڈے کی طرح کی معرکہ آرائی ہوئی اور انقلابیوں کی نئی نوجوان ترک پارٹی جو گندر نے سرکاری اسلحہ خانے پر حملہ کیا اور اندر کے لیڈر سوریہ سین اور ان کے ساتھ جلال آباد کی پہاڑیوں پر برطانوی فوج کا مقابلہ کرتے ہوئے مشینوں سے شہید ہو گئے۔۔۔۔ نوجوان شانتی بے بی اور سٹیٹ بے بی کو ملا کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو پستول کا نشانہ بنانے کی سزا میں کالے پانی بھیج دیا گیا ہماری بینا داستان یک بنگال کے گورنر پر گولی چلادی چند سال قبل ہی کی بات ہے کہ بنگال کے انسپکٹر جنرل پولیس انسپکٹر جنرل آف پولیس اور سیشن جج کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا مدناپور کے تین انگریز جج ایک کے بعد ایک مارے جا چکے تھے"[2]

درج بالا اقتباس میں سات بڑے شہروں کا ذکر ہے یہ ذکر نہ صرف قرۃ العین حیدر کی سیاسی بصیرت بلکہ جغرافیائی اعتبار سے بھی ان کے مطالعہ کا غماز ہے یو-پی، کالاپانی، آندھرا پردیش اور الہ آباد کے ناموں سے تو بر عظیم کے بسنے والوں کی اکثریت مانوس ہے مگر علی پور، مدناپور اور چاٹگام کے علاقے اور ان میں پیش آنے والے واقعات سے واقفیت اسی صورت ممکن ہے جب مصنف نے کہانی لکھنے سے پہلے اس خطے کا بھرپور سیاسی مطالعہ کر رکھا ہو اور ان واقعات سے شناسا ہو جو بڑے منظر نامے پر اپنی جگہ نہیں بنا سکے۔ ممکن ہے کہ قرۃ العین حیدر نے بنگال کی جادوئی سرزمین کو موضوعِ سخن بنانے سے پیشتر کوئی ایسا چارٹ یا

فہرست مرتب کی ہو جو بنگال کے مرکزی اور ثانوی علاقوں پر مشتمل ہو اور پھر اس کی مدد سے ان علاقوں میں ہونے والے اہم واقعات کا خاکہ دوسرے واقعات کی مدد سے مکمل کر کے اس اقتباس میں پیش کیا ہو۔

ناولوں میں تاریخیت کے درجے

قرۃ العین حیدر کے سب ہی ناولوں میں تاریخیت کے مختلف درجے دیکھے جاسکتے ہیں بالخصوص "آگ کا دریا" اور "چاندنی بیگم" تاریخ کے ہی کوئی "افسانائے" ہوئے باب لگتے ہیں۔ ایک طرف "آگ کا دریا" جیسا ضخیم اور بڑا ناول ہے جو قرۃ العین حیدر کے ناولوں کو لارنس سٹرن (lourence streren) اور جیمز جوائس (James Joyce) کی شعور کی رو کے مقابل کھڑا کر کے ہندوستان کی ہزاروں سالہ تاریخ کا بیانیہ بن جاتا ہے تو دوسری طرف "چاندنی بیگم" ہے جو پوسٹ کالونیل دور کے طرز معاشرت، رہن سہن، زیورات، ظروف سے ٹکراتا ہوا اس دور کے ذہنوں کی تشکیل کرنے والے عوامل سے تاریخ بیان کراتا ہے۔ کس طرح ایک عرصے تک محکوم رہنے والی قوم نے اپنے آقاؤں سے ان کے اطوار سیکھے اور غلام ابن غلام کا کلچر فروغ پایا۔ ٹو-آنہ قسم کے جاگیرداروں نے اس ملک کی تاریخ ہی نہیں لکھی بلکہ قنبر علی جیسے انسانوں کی تقدیریں بھی لکھتے رہے۔ اسی طرح آئندہ کے ناولوں میں قوموں کے عقائد، رسوم، لوک ادب اور ثقافتی ورثے کے تاریخ پر اثرات بھی قرۃ العین حیدر کے ذہن میں گردش کر رہے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں کو ناقدین کی نظر میں بڑا درجہ حاصل ہوا۔ تاہم "آخر شب کے ہمسفر" کے ساتھ یہ رویہ روا نہیں رکھا گیا بلکہ اس کے ساتھ ناقدین نے قرۃ العین حیدر کے سوتیلے جائیوں کا سلوک کیا۔ قرۃ العین حیدر پر لکھے گئے بیشتر تنقیدی مقالوں میں "آخر شب کے ہمسفر" کا تذکرہ محض اضافی اور رسمی معلوم ہوتا ہے یا پھر اس کا تقابلہ "آگ کے دریا" سے کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ امر باعث تعجب ہونے کے ساتھ ساتھ ناقدین کی عدم بصیرت کا بھی احساس دلاتا ہے کہ وہ ناول جس کے خال و خد ایسے واقعے پر بنے گئے جو مصنف کے سامنے وقوع پذیر ہوا اور محض چند سال بعد ہی ضبط تحریر میں آگیا۔ اس ناول کا خصوصی مطالعہ یقینا قرۃ العین حیدر کے عصری سیاسی نظریات اور عصری ماحول سمیت ایسے تمام عوامل کو سمجھنے میں بڑا مددگار ثابت ہو سکتا ہے جنھوں نے ان کے ادب کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ناول کے اہم تصورات میں ایک بڑا تصور تصور مکاں بھی ہے۔ جب کوئی مورخ تاریخ مرتب کرتا ہے تو اس دور کی پوری زندگی کی تصویر نہیں کھینچتا بلکہ ہونے والے چیدہ چیدہ واقعات جو ملک کی تاریخ پر اثر انداز ہوئے ہیں، ان کا بیان لکھتا ہے۔ ایک مصنف کے پیش نظر ایسا کوئی سیاسی یا تاریخیت نویسی پر مبنی ایجنڈا نہیں ہوتا اور وہ اس دور کی سماجی اور معاشرتی زندگی کے مرقعے پیش کرتا ہے۔ یہ خاکے جغرافیائی اعتبار سے علاقوں کی تہذیب کو سمجھنے میں بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً ہومر کی اوڈیسی کسی صورت اتنے مضبوط تاثر کی حامل نہ ہوتی اگر اس میں ان تمام جگہوں کا ذکر نہ کیا گیا ہوتا جہاں ہومر نے اوڈیسی کو عازم سفر دکھایا۔ دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو اگر آج اس دور کے علاقوں کے متعلق جاننا ہو تو یہ منظومات ہی حقیقی معاشرتی مرقعے پیش کرتی ہیں لہذا کسی فن پارے میں درج مقامات کی اہمیت ناگزیر ہے۔ فکشن یا افسانوی ادب کے کسی بھی صنف (genre) میں

اماکن کی اہمیت صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ سیٹنگ فراہم کریں جس میں کہانی وقوع پذیر ہو رہی ہے بلکہ یہ کرداروں کی زبان، لب و لہجے، موسمی تغیرات کے کہانی پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثرات، رہن سہن یہاں تک کہ کپڑوں اور کھانوں کی تفصیلات بھی اسی وقت درج کی جا سکتی ہیں جب محل وقوع کے متعلق طے کر لیا جائے۔ مثلاً قرۃ العین حیدر نے "علاول" اور "بنگال کی اقتصادی تاریخ" کا جو تذکرہ "آخر شب کے ہمسفر" میں کیا ہے وہ اسی صورت میں ممکن تھا جب یہ کہانی بنگال میں بنی جا رہی ہو۔ یورپ کے کسی ملک میں رہنے والا اگر "علاول" کو پڑھے گا تو کہانی بے جان اور بد ذائقہ ہو جائے گی۔ اسی طرح بنتھا بھات، مچھلی بھات اور بھنے ہوئے چاولوں کے میٹھے لڈو بنگال ہی کے کسی گاؤں میں بیٹھ کر کھائے جا سکتے ہیں۔ امریکہ کا کوئی 'ہوم لیس' شخص 'فش اینڈ چپس' کھاتا دکھایا جائے گا تو ہرگز عجیب نہیں لگے گا لیکن اگر وہی شخص مچھلی بھات کھاتا ہوا دکھایا جائے گا تو پڑھنے والا کہانی سے منقطع ہو جائے گا۔ لہذا کہانی کے تاثر کی بہتر تفہیم کے لئے اماکن کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

بنگال کی حالت کا نقشہ

بنگال کی اقتصادی، معاشی، معاشرتی، سیاسی اور سماجی حالت کا جو نقشہ قرۃ العین حیدر نے کھینچا ہے وہ ان کی کہانی کی ایگزیکیوشن اور تلازمہ خیال کو سمجھنے میں بھی اہم حیثیت رکھتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ ناول جس دور میں لکھا گیا (1979) وہ انٹرنیٹ کے اژدھام سے پہلے کا دور ہے اور قرۃ العین حیدر خود بھارت کے شمالی حصے تک محدود اور وہیں رہائش پذیر رہیں تو یقیناً بنگال کی بود و باش پر مبنی کہانی کی ایگزیکیوشن کے لیے انہوں نے باقاعدہ سوچا سمجھا مطالعہ کیا ہو گا جب ہی وہ اس قابل ہوئیں کے وہاں کے علاقوں، عمارات، کالجوں، سڑکوں، عجائب گھروں، ہسپتالوں، نواحی علاقوں اور آشرموں وغیرہ کو کہانی کا حصہ بنا سکیں۔

> "1979 میں شائع ہونے والا ناول "آخر شب کے ہمسفر" میرے خیال میں "آگ کا دریا" سے زیادہ کامیاب فن کاری کا نمونہ ہے۔ تاریخ، سیاست، معیشت اور معاشرت کے وسیع موضوعات اس ناول میں بھی "آگ کا دریا" ہی کی طرح مواد فن بنائے گئے ہیں۔ لیکن اس میں عمرانی افکار و واقعات پر ناول کی مخصوص ہیئت غالب ہے، جبکہ "آگ کا دریا" میں ہیئت کا سانچہ بعض اوقات افکار و واقعات کے بوجھ تلے دب کر جا بجا چٹکنے لگتا ہے۔ "آگ کا دریا" میں فلسفے کی حکمرانی ہے اور آخر شب کے ہمسفر میں فن کا تسلط۔۔۔ ناول کے واقعات و افکار مصنفہ کے لئے اجنبی نہیں بلکہ ان کے تجربے میں شامل ہیں اور وہ براہ راست ان سے واقف ہیں لہذا پوری آگہی اور اعتماد کے ساتھ انہیں ماجرا و قصہ کے طلسم میں اسیر کر لیتی ہیں۔ اسی لئے اس ناول کے کردار بھی زیادہ زندہ حقیقی، متحرک اور موثر ہیں۔ "آخر شب کے ہمسفر" میں ایک قسم کا واقعاتی استناد ہے، جو اس کی عصری حسیت کو تیز کرنے کا باعث ہے"[3]

علاقوں کا ذکر

"آخر شب کے ہمسفر" میں جن شہروں اور علاقوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں کئی شہروں کا ذکر ہے۔ جن کی فہرست یہ ہے۔ ڈھاکہ، کلکتہ، لندن، باریسال، پٹنہ، دہلی، برلن، یو–پی، آندھرا پردیش، الہ آباد، چاٹگام، لدھیانہ، علی گڑھ، کاٹھیاواڑ، سرنگاپٹنم، لاہور، پشاور، کراچی، نیویارک، ٹوکیو، ہونولولو، بریڈفرڈ، چیلسی، ہیمبرگ، فرینک فرٹ، ایتھنز، پورٹ آف سپین، نیو اورلینز، مدراس، جموں، چٹاگانگ، ہردوار، رشی کیش، اعظم گڑھ، سیرام پور، منی پور، دیناج پور، رام پور، سیتاپور، رنگ پور، مدناپور، بول پور، کھلنا، نواکھلی، رائے پور، فرید پور، نارائن گنج، سنگار پور، مرشد آباد، سنتھال پرگنہ، صاحب گنج لائن، تیج گاؤں، یونان، ٹرینیڈاڈ، آئرلینڈ، روس، برطانیہ، اٹلی، امریکہ، کینیڈا، ہندوستان، اسکاٹ لینڈ، پاکستان، آسٹریلیا، وینزویلا، برازیل، ویسٹ انڈیز اور بنگلہ دیش۔ ڈھاکہ ڈویژن کے نسبتاً کم معروف علاقے، جن کا تذکرہ اس ناول میں ملتا ہے، کی فہرست یہ ہے علی پور (گاؤں)، لال باغ، چاند پور (گاؤں)، مداری پور، شوناپور، سگن باغیچہ، کالی گھاٹ اور لال منیر ہاٹ۔ اس ناول میں جن شہروں کا ذکر کیا گیا ہے وہ چھ ملکوں یعنی بنگلادیش، برطانیہ، بھارت، جرمنی، پاکستان اور یونان کے شہر ہیں ان کے علاوہ مزید گیارہ ملکوں کا نام استعمال کیا گیا ہے۔ اتنی کثیر تعداد میں ممالک کے نام استعمال کرنے کے پیچھے کیا وجہ رہی ہو گی اور ایک ایک ناول میں سینکڑوں مقامات درج کرنے کے باوجود ان کا ناول، ناول کیسے برقرار رہتا ہے رپورتاژ کیوں نہیں بن جاتا؟

> " ذہنی ہجرت و سیاحت کی اس کیفیت کا اندازہ کرنے کے لیے دیکھنا چاہیے تھے کہ مسلم اور ہندو معاشرے کے ایشیائی ماحول کے ساتھ ساتھ مسیحی معاشرے کا یورپی ماحول قرۃ العین کا ایک مستقل موضوع ہے اور "آگ کا دریا" کی طرح "آخر شب کے ہمسفر" میں بھی وہ کچھ عرصے کے لیے اپنے بعض کرداروں کے ساتھ مغرب کی زیارت کرتی ہیں، اور وہاں سے مشرق کی طرف مراجعت کرتی ہیں۔ یہ عالمی سیاحت قرۃ العین کے طریقے داستان گوئی کا ایک نمایاں عنصر ہے۔ شاید وہ عصر حاضر کے تیزی سے ابھرتے ہوئے بین الاقوامی معاشرے پر تاکیدی نشان لگانا اور بتانا چاہتی ہیں کہ جدید ہندوستان کی نئی نسلیں مشرق کے ساتھ ساتھ مغرب سے بھی ایک تہذیبی ورثہ پا رہی ہیں" [4]

مدہم ہوتی ہوئی تہذیبوں کی متوازی دنیا

دراصل قراۃ العین حیدر مدہم ہوتی ہوئی تہذیبوں کی متوازی دنیا دکھانا چاہتی ہیں۔ اس ضمن میں ان ملکوں کے اور شہروں کے نام بڑی اہمیت کے حامل ہو جاتے ہیں کیونکہ تمام ملک جن کا تذکرہ قرۃ العین حیدر کے "آخر شب کے ہمسفر" (بلکہ دیگر ناولوں میں بھی ملتا ہے) وہی ہیں جہاں نوآبادیاتی دور میں بڑی تعداد میں ہندوستانی منتقل ہوئے اور مستقل رہائش اختیار کر لی۔ یہ افراد اپنی مقامی اور سات سمندر دور کی تہذیب میں ایک پُل کا کردار ادا کرتے ہیں جنھوں نے نہ صرف ہندوستان کی معاشرت، معیشت اور سماج کو متاثر کیا بلکہ اقدار کو بھی بڑی حد تک تبدیل کر دیا۔ ملکوں اور شہروں کے ضمن میں یہ بات اس طرح بھی ثابت کی جاسکتی ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں وہ کپڑے، اشیا، کھانے پینے کی چیزیں الغرض طرز بودوباش کی ہر وہ چیز رائج

ہے جو ان ملکوں میں رائج تھی جہاں ہندوستانیوں کا آنا جانا زیادہ رہا ہے۔ یہ وہی ممالک ہیں جن کا ذکر قراۃ العین حیدر کے "آخر شب کے ہمسفر" سمیت دیگر ناولوں میں ملتا ہے۔ امریکہ، برطانیہ، جرمنی سمیت دیگر ممالک نہ تو ہمارے ہاں بیشتر آبادی نے دیکھے ہیں نہ کبھی ان کے باشندوں سے دوبدو ملاقات کی ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے ہاں kimono اور sinh shuka نہیں بلکہ پینٹ شرٹ اور کوٹ رائج ہے۔ دراصل قراۃ العین حیدر اور ایسے تمام لکھنے والوں کے ادب کا ہی یہ اعجاز ہے کہ ان کے الفاظ نے تہذیبوں کے درمیان پل کا وہ کردار نبھایا جسے حقیقی زندگی میں مہاجرین نبھارہے تھے۔

ممالک اور شہروں کے بحر بے کراں کے علاوہ "آخر شب کے ہمسفر" میں لاتعداد بنگالی تعلیمی اداروں، گھاٹوں، سڑکوں اور ہسپتالوں وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان مقامات کے استناد کو جانچ کر قرۃ العین حیدر کے فن کی نئی باریکیاں دریافت کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً "آخر شب کے ہمسفر" کی دیپالی سرکار ایڈن گرلز کالج نامی ادارے میں زیر تعلیم ہے۔ یہ ادارہ اب ایڈن مہیلا کالج کے نام سے جانا جاتا ہے جس کی بنیاد 1873 میں اعظم پورہ ڈھاکہ ڈویژن میں رکھی گئی تھی۔ بنگلہ دیش کی وزیر اعظم شیخ حسینہ واجد اسی کالج کی تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ کالج نوجوان بنگالی لڑکیوں میں سیاسی بیداری اور تحریک کا ہمیشہ سے باعث رہا ہے بلکہ حال ہی میں سیاسی تنازعات کی وجہ سے خبروں کی زد میں بھی رہا۔ اگرچہ جس زمانے میں قرۃ العین حیدر نے "آخر شب کے ہمسفر" تحریر کیا اس وقت کالج میں سیاست کو اتنا دخل نہیں تھا مگر قرۃ العین حیدر کے کھینچے ہوئے اس سانچے پر آج کا ایڈن مہیلا کالج عین پورا اترتا ہے۔ لندن سکول آف اکنامکس نامی ادارے کا بھی ذکر اس ناول میں ملتا ہے یہ ادارہ بھی حقیقت میں وجود رکھتا ہے جس کا سنگ بنیاد 1895 میں رکھا گیا۔ لندن کی نامی گرامی ہستیاں، کئی صدور اور اہم شخصیات یہاں سے فارغ التحصیل ہیں۔ اس ادارے کی شہرت کی وجہ سے آبادیاتی دور میں اہم عہدوں پر فائز ہندوستانی اپنی اولاد کو یہاں تعلیم کی غرض سے بھیجا کرتے تھے۔ اسی رجحان کا مظہر "آخر شب کے ہمسفر" کا کردار اوما دیبی ہیں جن کو اس ادارے سے تعلیم حاصل کرتے اور وطن واپسی کرتے دکھایا گیا ہے۔ وہاں سیکھے گئے افکار و نظریات ہی انہیں اکنانومسٹ اور درپردہ نکسلائٹ بننے پر ابھارتے ہیں۔ ایک اور تعلیمی ادارہ جس کا ذکر اس ناول میں ہے وہ ڈھاکہ یونیورسٹی ہے۔ اوپر کی سطور میں مذکور اوما دیبی ڈھاکہ یونیورسٹی سے ایم اے گریجویٹ بھی دکھائی گئی ہیں۔ ڈھاکہ یونیورسٹی ڈھاکہ میں واقع ایک قدیم تعلیمی ادارہ ہے جس کا قیام 1921 میں عمل میں آیا۔ اس یونیورسٹی کی تشکیل میں بنگال کے مسلمان امرانے اہم کردار ادا کیا تھا اور قیام کے بعد بھی یہ درسگاہ بنگال کی تقدیر بنانے میں اہم ثابت ہوئی۔ یہ ادارہ سیاسی لحاظ سے بھی اہم شخصیات کی آماجگاہ بنا رہا اور کئی بنگالی صدور اور شخصیات یہاں سے تعلیم حاصل کر کے نکلیں جنہوں نے تشکیل بنگلہ دیش اور بعد ازاں قیام بنگلہ دیش کی سیاسی تاریخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

شانتی نکیتن نامی جس ادارے کا ذکر بار ہا اس ناول میں کیا گیا ہے اسے بھی بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) کی تاریخ میں خاصی اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ یہ ادارہ بنگالی ست گرو رابندر ناتھ ٹیگور کے والد نے تعمیر کرایا جس کا بنیادی مقصد 'شانتی' تھا۔ والد کی وفات کے بعد رابندر ناتھ ٹیگور نے اس کی باگ ڈور سنبھالی اور اسے باقاعدہ ایک یونیورسٹی کا روپ دیا۔ اس ادارے کا یہ سفر قریباً چار

دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے جسے قرۃ العین حیدر نے ان سطور میں سمیٹ کر بنگال کی تاریخ کے اس نامور ادارے کو ناول کا حصہ بنایا ہے۔ اس ادارے کے احاطے میں موجود برہمو مندر کا بھی ذکر ناول میں ملتا ہے۔

"1863 میں مہارشی نے اپنی آرام و آسائش کی زندگی تیاگ کر یہاں شانتی نکیتن آشرم قائم کیا۔ شانتی نکیتن ولا تعمیر کروائی اور یہاں رہنے لگے۔ برگد کے اس درخت کے نیچے انہوں نے ایک مرمریں معبد بنوا کر اس کے پھاٹک پر لکھوایا۔

آمار پرانیر آرام

مونیر آنند

آتمار شانتی

اس درخت کے نیچے مہارشی کو خدا مل گیا تھا۔

آج یہ شانتی نکیتن ہند قدیم کی جنگل کی درسگاہوں کی طرز پر بنے ہوئے دارالعلوم بھارتی انٹرنیشنل یونیورسٹی کے نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے گاندھی اور واردھا آشرم، نہرو اور آنند بھون، اور ٹیگور اور شانتی نکتین والے ہندوستانی کو قومی جدوجہد کے ایک انتہائی نازک موڑ پر لا کھڑا کیا ہے"[5]

ہندو کالج نامی ادارے

"آخر شب کے ہمسفر" میں ہندو کالج نامی ادارے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں:

"رام موہن رائے نے 1818 میں ہندو کالج قائم کیا۔ اس کے طلباء اپنے مذہب سے برگشتہ ہوتے جا رہے تھے۔ متعدد انگریزی تعلیم یافتہ برہمن خاندان عیسائی ہوگئے۔ عیسائیت ایک فاتح، عقلیت پرست، حیرت انگیز، شاندار قوم کا بڑا معقول مذہب تھا۔ نئے بنگالی مصلحین، ہندو، برہمو، عیسائی سبھی انگریز کے حامی تھے، جو اس اندھیرے ملک میں روشنی پھیلا رہا تھا"[6]

اگرچہ یہ کالج حقیقت میں موجود ہے تاہم اس کا قیام 1818 میں نہیں بلکہ جنوری 1817 میں عمل میں آیا اور اس کو قائم کرنے میں رام موہن رائے کے علاوہ دیگر اکابرین شہر کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اسی طرح سینٹ جانز کالج آگرہ کا بھی ذکر اس ناول میں ملتا ہے۔

خلاصۂ بحث

مذکورہ بالا تمام بحث کا حاصل کلام یہ ہے کہ تعلیمی اداروں کے علاوہ جن عمارات کا تذکرہ ناول میں کیا گیا ہے ان میں کلکتہ میوزیم، ریڈیم ہسپتال، مشہور لال باغ، مغل قلعہ ڈھاکہ، ست گنبد مسجد، بی بی پری مقبرہ، ڈی ایمنز ہاؤس شامل ہیں۔ ناول میں سڑکیں

(کراچی بندر روڈ، علی پور روڈ)، بازار (بیگم بازار)، ٹرین سٹیشنوں (سیالدہ، بردوان) وغیرہ کا بھی ذکر ملتا ہے۔ حقیقی عمارات کے علاوہ قراۃ العین حیدر نے ناول میں جو افسانوی عمارات تخلیق کی ہیں، تاریخ ڈھاکہ کا جائزہ لینے پر یہ عمارات کسی اور نام کے تحت دکھائی پڑتی ہیں۔ مثلا ارجمند منزل جس میں "آخر شب کے ہمسفر" کے اہم کردار رہائش پذیر ہیں وہ احسان منزل کا افسانوی روپ معلوم ہوتی ہے۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تخیلاتی واردات میں حقیقت ہی سے اثرات قبول کئے گئے اور حقیقی عمارات کو نام کی تبدیلی کے ساتھ کہانی کا حصہ بنایا گیا۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے اس ناول میں بنگال کے اماکن کے اندراج کے ذریعے دراصل بنگال کی پوری تاریخ اور تہذیب کا نقشہ پیش کر دیا ہے۔ تمام اہم ترین عمارات جنہوں نے تاریخ بنگال بنانے یا بگاڑنے میں کلیدی کردار ادا کیا ان کا تذکرہ اس ناول میں ضرور مل جاتا ہے۔ ان تمام عمارات اور مقامات کا تذکرہ قرۃ العین حیدر کے بطور لکھاری قد پر مہر ثبت کرتے ہیں اور شاہد ہیں کہ باقاعدہ دقیق جغرافیائی تحقیق کے بعد ہی یہ ناول تحریر کیا گیا۔

References

[1] Dr. Reḥmat Ali Shād, *Qurat-ul-Ain Haider ka Tawsawur Tareekh-o-Mazhab* (Lahore: Al-Waqar Publications, 2017 AD), 276.
[2] Qurat-ul-Ain Haider, *Ākhir Shab ky Ham-Safar* (Lahore, Sang-e-Meel Publications, 2012 AD), 50.
[3] Dr. Abd al-Mughnī, *Qurat-ul-Ain kā Fan* (Dehli: Modern Publishing House, 1994 AD), 106.
[4] Al-Mughnī, *Qurat-ul-Ain kā Fan,* 11.
[5] Qurat-ul-Ain, *Aakhir Shab ky Ham-Safar,* 68.
[6] Qurat-ul-Ain, *Aakhir Shab ky Ham-Safar,* 46.